باب ۱

چودھویں صدی

(ہوتا ہے جادہ پیما اب کارواں ہمارا)

چودھویں صدی و مابعد

ایک روایت ہے حضور اکرمؐ نے تیرھویں صدی تک کے حالات کی لوگوں کو خبر دی اور چودھویں صدی کا ذکر آیا تو خاموش ہوگئے۔ایک ضعیف حدیث یہ بھی ہے کہ چودھویں صدی کے لئے فرمایا 'میں' خود آؤں گا۔مہدی آخر الزمان کی بابت بھی لوگوں کا خیال ہے کہ تشریف لاکر اسلام میں نئی رُوح پھونکیں گے اورحرم میں اذان دیں گے۔اگر عقائد کو باطن کی طرف سے منسُوب کریں تو **"کُنْ فَیَکُوْنَ"** جاری و ساری ہے۔نورِ محمدیؐ سلسلہ جاریہ ہے اورحرمِ دلِ عالم میں مہدیؑ اذان بھی دے چکے ہیں۔

حضور بابا قادر اولیاءؒ (وزیا نگرم جنوبی ہند) نے فرمایا لوگ کہتے ہیں **"کُلُّ شَیْءٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتَ"** فقیر کہتا ہے **"کُلُّ شَیْءٍ ذَائِقَةُ الْاَسْلَامْ"** حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ اتنا پیارا زمانہ ہے کہ آپ کے پاس اگر کوئی چیز ہےتو اس کوقبول کرنے کے لئے بہت سے قلب تڑپ رہے ہیں۔لوگ اس زمانہ کو بُرا زمانہ کہتے ہیں۔ بہ نسبت دوصدی پہلے کے آج بھی فاسق و فاجر مسلمان تک میں اس نامِ محبوبؐ کی لاج رکھنے کے لئے بے پناہ جوش ہے۔ یہ جوہر کسی دوسری قوم میں نہیں۔اس والہانہ محبت کا عبادت سے قطعی تعلق نہیں۔ یہ ایک جذبہ لطیف ہے۔اسی قسم کی لطافتوں پر اگر نظر رکھی جائے تو صلاحیتوں کے اعتبار سے یہ زمانہ بھی بہت بہتر زمانہ ہے۔ یہ عین اصولِ فطرت ہے کہ جتنی تاریکی زیادہ ہوتی ہے اس میں دھندلی سے دھندلی لو بھی شمع درخشاں دکھائی دیتی ہے۔اس لحاظ سے آج جس کو بدترین زمانہ کہتے ہیں وہی بہترین زمانہ بھی ہے کہ آج ذرا سی حرکت، باطن اور ظاہر کی، وہ گُل کھلاتی ہے کہ مذبذب ایمان بھی قوت پکڑتے جاتے ہیں۔اب تقاضا

ہے کہ بظاہر نام لیوا، مسلمان کی اِصلاح کی جائے۔ یہ کٹھن بات ضرور ہے اس لئے کہ ظاہری تعلیم اور رشد و ہدایت سے کام نہیں بن سکتا۔ وہ دور ختم ہوگیا۔ ظاہر کا خول ہی خول رہ گیا ہے۔ اور باطن بھی بالکل گُل ہو چکا ہے۔ اس کی مرمت نہیں ہوسکتی۔

فقیرانا اُمّتی کا کام:

اب تو قلوب پر روشنی کی تجلی دینے سے ہی کام بن سکے گا اور یہ کامل فقراء کا کام ہے کہ باطن سنواریں، کیونکہ فقراء اُمّت کے اعصابی نظام کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہو جائیں تو باقی نظام خودترتیب پاجاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اللہ کی مشیت یہی ہے، اس میں کس کو دخل، تو دل نہیں مانتا کہ اللہ کی مشیّت یہی ہے کہ تباہی ہو، بربادی رہے۔ اللہ کی مشیّت اور بندہ کی مشیّت میں فرق ہونا چاہیے۔ اللہ تو بے نیاز ہے صَمَدٌ ہے۔ مگر وہ اپنے خاص احسان سے اپنے اولیاء کو نوازتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فُقراء امر باللہ ہوتے ہیں اور فقیر کے ساتھ امر شامل ہوتا ہے۔ امر کیا ہے کُنْ فَیَکُوْن۔ یہی بات ہے کہ عارف باللہ کی بسم اللہ کُن فیکون ہوا کرتی ہے اور اُمّت کا مسئلہ کُن فیکون کہنے والے سے ہی حل ہوتا ہے۔ یہ فقیر وہ ہوتا ہے جو آنا اُمّتی کہہ سکنے کا حقدار ہو۔ جس کی جان جانِ عالم ہو۔ کم از کم اتنی بات تو ہو۔ یہ بھی ابتداء ہے۔

جب بندہ قُمْ بِاذن اللہ کہتا ہے تو قانونِ قدرت مقرر ہے اس کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ لیکن قُمْ بِاذْنِیْ کہدے تو اللہ بندے کی لاج رکھ لیتا ہے۔ یہ قُمْ بِاِذْنِی یہ بسم اللہ، یہ کُن عالِم امر کی بات ہے۔ فقیر کے ساتھ امر شامل ہوتا ہے۔ یہی ہے سب راز کن فیکون کا۔ غوث الاعظمؒ نے فرمایا تھا فقیر وہ نہیں جس کے پاس کچھ نہیں، بلکہ فقیر وہ ہے جس کے ساتھ امر شامل ہے۔ یعنی کن کہے تو ہو جائے۔ یہ فقیر ہے آسمان تجلیات جنہیں کہ لئے فقیر ہوگیا تھا ہے جسے

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صورتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

آنحضرتؐ کو اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ مثال بنا دیا۔ لیکن اب اس کا اَلَمْ نَشْرَحْ ہے۔ اس

کے لئے فقیر کی ضرورت ہے۔قلوب کو کھول دینا صاحب وقت کا کام ہے۔اور یہ وہ ہی کرسکتا ہے جس نے راستہ پورا کیا ہو۔لہذا اب جو کچھ ہونا ہے عالمِ مثال کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ تا کہ چور دروازوں سے باطنِ انسانی تبدیل کیا جاسکے ۔ یہ باطن کی تبدیلی ظاہری اعمال، وعظ ونصیحت، رشد و ہدایت سے نہیں ہوا کرتی۔اس کا تعلق عقل سے نہیں ہوتا۔ وہ تو پچھلا زمانہ تھا جب عقل کی طرف رجوع تھے۔ جیسے امام غزالیؒ وغیرہ۔

اس وقت باطن کی طرف لے جاتے تو مذہب ختم ہو جاتا۔مگر اب قوتِ باطن بھی بڑھتے بڑھتے برابر کی سطح پر آئی ہے،اس لئے چودھویں صدی میں فقراء کا باطن کی طرف رجوع ہے۔باطن کا راستہ عشق اور صرف عشق سے کھلتا ہے۔عشق کے جاگنے کا تعلق عالم امر سے ہے۔ یہ مجاہدوں اور ریاضتوں والی بات نہیں۔ نہ ہی یہ طریقت والوں کا کام ہے۔ وہ تو اتنا بتاتے ہیں یہ کرو نہ کرو۔مگر باطن کا راستہ بتانے والا کم ہی ملتا ہے۔ یہ ہی تو غوثیت ہے کہ

یا غیاث المستغثی در کشابر جانِ ما

(اے پکارنے والوں کی پکار کو پہنچنے والے ہماری جانوں میں رُونمائی کر)

یہ ہی تو عالمِ امر کی بات ہے کہ وہ توڑ دیوے یہ جوڑ دیوے۔

جانِ ما کو نئی حیات عطا ہونے کا ذریعہ چشتیہ سلسلہ میں عشق ہے۔عشق کے ذریعے ہی باطن کی صفائی کرائی جاتی ہے۔ چشتیہ کا حساب ایسا ہے جیسا سمندر کا ہوتا ہے۔گندی نالیاں اس میں جائیں تو بھی کچھ نہیں۔سب نمک ختم کر دیتا ہے۔ دوسرے سلسلوں میں نفس سے جہاد،شیطان پر لاحول،توبہ استغفار۔مگر شیطان سے جہاد کیا یا توبہ استغفار کرتے رہے تو یار کو یاد کرنے کا وقت کہاں۔اور ایک شیطان کو دبایا تو دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے۔عشق کا معاملہ دوسرا ہوا کرتا ہے ۔عشق کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ شیطان بھی رسُولِ کریمؐ کے اِرشاد کے مطابق مسلمان بنالیا جاتا ہے۔عشق کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

بے حجابانہ در آ از درِ کاشانہ ما

(اے نورِ مُجسّم ہمارے گھر کے دروازے سے بے حجاب آ)

ساری کائنات صدقے اس ''بے حجابانہ در آ'' پر۔ اللہ اِستقامت دے۔ بڑی چیز ہے وگرنہ تانک جھانک تو سب ہی کر لیتے ہیں۔عشق کے ذریعے باطن روشن ہوا تو وصل کا راستہ کھلا۔

چودھویں صدی میں راستہ وصل سے ہی شروع ہوتا ہے۔ وصل کا راستہ یہی ہے کہ کسی کے عشق میں اپنے کو فنا کردو۔یعنی اپنی بتی کسی دیے میں ڈال دو بڑا قرب حاصل ہوجائے۔یعنی قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ہو جائے اور دونوں بتی آپس میں مل جائیں تو پھر ایک لودو وجود ہونگے۔ میں تُو تُو میں پھر تُو کون اور میں کون، میں غائب تُو ہی تُو۔حقیقت ایک ہی تو ہے۔ جب لَا اِلٰہ کر دیا تو اللہ رہ گیا۔ یہی تو ہے۔لَا اللہ اِلا اللہ جب تک غیرحق باقی ہے لا الہ کہاں ہوا۔کلمہ پڑھنے سے کیا حاصل،کلمہ تو ہو جانے والی بات ہے۔ وصل کا مقام ہی ولایت کا مقام ہے۔قرب یعنی وصل ہونے کے بعد ہی نبوت اور تبلیغ کا مقام آسکتا ہے۔ اور ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کے مقام کو اپنایا جاسکتا ہے۔اب سوچیں کہ حضورؐ کا مقام کیا ہے۔ واصل باللہ کا مقام کیا ہوتا ہے۔ نبی کریمؐ کی نبوت وصل کے بعد حیات کی تفسیر ہے۔اس کو سمجھیں۔اس نکتہ کو پکڑیں ۔ یوں کہنے سے کیا فائدہ کہ اتباعِ سنّت کرو۔ اسلام کو سمجھو، سوچو کہ ادھر سے تعلق پیدا ہو۔وصل کا راستہ بنے تو نقشے ہی بدل جائیں۔

تیرہ صدی میں اسلام کی صحیح چاشنی کو کسی نے بیان نہیں کیا۔تبلیغ کے پیچھے تو لگ گئے مگر وصل کی بات نہ ملّا نے چھیڑی نہ صوفی نے۔ حالانکہ یہ اتنی پیاری چیز ہے کہ بہرسُورقصِ بسمل کا قصہ ہو جائے۔سوچو کہ جب تعلق ہی نہ ہوا تو پھر کیا بسم اللہ یا الحمد للہ مجال ہے کوئی بسم اللہ یا الحمد للہ کہہ سکے وصال سے پہلے۔

صداقتِ عشق، شرعِ باطنی کی اساس

لوگ کہتے ہیں، اُمّت کے فروغ کا راز شرع کی پابندی سے وابستہ ہے۔اور اکملیت کے لئے شرع ضروری ہے۔ یہ حق ہے۔مگر شرع کے لئے بھی تو یہ جاننا ضروری ہے کہ کس مقام سے۔ کیونکہ شریعت تو

قالب کے لئے ہے اورطریقت قلب کے لئے۔قلب کی دنیا تو خیر ہے ہی عشق ۔مگر قالب کی حد تک بھی خلوص ضروری ہے۔اس لئے فرمایا ہے کہ شریعت بغیر اخلاص ریا ہے، بدترین گناہ ہے ،حتیٰ کہ "لَا صَلٰوۃَ اِلَّا فِی الْحَضُوْرُ الْقَلْبِ" عبودیّت کے لئے یقینی شرع ضروری ہے،لیکن مقامِ عبودیت تو عارف سے بھی اونچا مقام ہے کیونکہ عرفان حاصل کرنا اس کے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔مُنتہائے عبودیت اُسوۂ حَسَنہ نبی کریمؐ ہیں۔ یہ اکملین کا مقام ہے۔ یہ شرح باطنی یعنی قلب میں صداقتِ عشق کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔شرعِ باطنی تو خیر بڑی چیز ہے' باطن کی طہارت بھی کسی کسی کے نصیب میں ہوتی ہے۔ یہ ظاہر داری سے ارکان ادا کر لینا شرع نہیں۔ بسا اوقات ہم اپنے وظیفے' اپنی نماز' اپنی قرآت میں اتنا مزا لیتے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں مزہ آتا ہے۔حالانکہ ہم اپنی انا کی پرستش میں لگے ہوتے ہیں۔ یہ سب ظاہر داری' خودفریبی ہے۔

مُقدّم جو چیز ہے وہ اخلاق کی درستگی ہے۔باطن کی صفائی ہے اور یہ بغیر عشق کے حاصل نہیں ہوتی۔ عشق ہی باطن سے ماسوا اللہ کو ہٹا کر ایک رُخی عطا کرتا ہے۔اس لئے پہلے اخلاق درست کرنے ہیں' دلوں میں عشق کی قندیل روشن کرنا ہے' بعد میں ارکان کی طرف توجّہ دینا ہے۔ یہ امر مُسلّمہ ہے کہ صدق' سچائی' امانت' محبت 'بنیادیں ہیں اخلاق کی۔لوگ رسول کریمؐ کے اخلاق ہی سے ان کی طرف رجوع تھے اوران کی ظاہری شرع کے راستہ پر چھوڑ کر کم ازکم افراد کوٹھیک کرنا ہے۔ان کے باطن کی صفائی ہوئی، ان کے قلب میں عشق جاگا۔ یہ ٹھیک ہوئے تو مِلّت ٹھیک ہوئی اور پھر شرع پر واپسی اخلاص اورصداقت کے ساتھ ہو سکے گی۔ یہ شریعت پر جو ظاہر داری کا خول دے کر پردہ کر رکھا ہے اس کوتوڑنا ہے۔مثلاً نیک عمل، خواہ خلُوص سے کیا ہو یا نہیں کیا ہو،صرف ظاہر داری سے پُورا کر لینے کے بعد کہہ دیتے ہیں کہ شرع پر عمل کرلیا۔ مانا کہ اس طرح بھی شرعی احکام پورا کر کے سوسائٹی کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔لیکن وہ صفاتِ حمیدہ جو مقامِ محمود تک پہنچاتی ہیں' وہ تو خالص اخلاص، ہمہ گیر محبت اورصداقت سے ہی آسکتی ہے۔حقیقت کے میدان میں تو یہ ظاہر داری گناہ ہے' یعنی ہر وہ چیز جو مقصد سے فعل پیدا کرے گناہ ہے۔اور جو قرب پیدا کرے' محبت کا رشتہ پیدا کرے وہ نیکی ہے۔قرب کے رشتہ میں بند ہے۔ وصل کے راستے سے آپس میں محبت کا رشتہ آنا

لازمی ہے۔یعنی جمعیت سے محبت ہو جاتی ہے۔اس سے زیادہ ٹھوس ثبوت اپنے شرع کے دعووں کی صداقت کا اور کیا مل سکتا ہے۔ ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ'' (آپس میں مومن بھائی ہیں) ایک روشن حقیقت بن جائے۔

حیات طیبہ کی بنیاد جمعیت:

قرآن کریم کی آیت ہے:۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَکَرٍ اَوْاُنْثٰی وَھُوَ مُومِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیَاۃً طَیِّبَہ وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ بِاَحْسَنِ مَاکَانُوْ یَعْلَمُوْنَ o

''مردوں اورعورتوں میں سے جس نے عمل کئے اوروہ مومن بھی ہیں تو اس کو ہم حیات طیبہ سے زندگی عطا کریں گے اوربہتر بدلہ دیں گے اس کے عمل کا''

اس آیتِ کریمہ کا اِطلاق اگر افراد پر میزان کے ساتھ ہوتا ہے تو ملّت کے ساتھ لامحدود برکتوں اور رحمتوں کے ساتھ۔ملت کو حیاتِ طیبہ عطا ہونے کی بنیاد افراد کے عملِ صالح پر رکھی گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب تک اجزاء روشن نہ ہوں کل میں روشنی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔اور غالبًا اسی وجہ سے تیرہ صدی تک الّا زمانۂ خلفائے راشدین' جتنے بھی عالم' صوفی اور راشد گزرے ہیں وہ تزکیۂ نفس اور قربِ الٰہی کا اِطلاق صرف انفاس یعنی افراد پر کرتے رہے اور غالبًا بجا کرتے رہے۔حکمِ الٰہی یہی تھا۔

لیکن زندگی کا افضل ترین نظریہ جو آگ اور سختیوں میں گذرنے کے بعد منکشف ہوا ہے یہی ہے کہ صرف زندگی کے روشن پہلو پر نظر رکھی جائے، تاریکی خود غائب ہونے لگتی ہے۔اپنے اندر جب تک نُور نہیں دوسروں کی روشنی نظر نہیں آتی۔حُسن اور سچائی اپنے ہی اندر ہے۔اپنے سے باہر نکل کر دوسروں کے آگے خوش خلقی اور تہ دل سے جھکیں تو خواہ تنکا بھی ہو اس میں حُسن نظر آئے گا۔دوسروں کی اچھائیاں دیکھنے کے لئے ظن پیدا ہو جائے گا۔یہی قدرت کا سادہ قانوں ہے۔اسلام ہے۔اسلام کا منتہائے نظر ہے ہی رُحَمَاء

بَیْنَھُم اُخوتِ کامل یعنی جمعیت کی خاطر عملِ صالح۔ یہ بات قوانین فطرت میں نہیں آتی ہے، کر کے دیکھنا ہوتا ہے۔تم میرے طرف ایک قدم بڑھو میں تمھاری طرف دس قدم بڑھتا ہوں ۔یہی بات ہے۔

رسول اللہؐ نے زبانی لیکچروں سے لوگوں کو رجوع نہیں کیا۔ بلکہ محبت سے۔ رسُول اللہؐ کے حکم پر مسلمان نتیجہ کی فکر یا صلہ جنت کی تمنا کے بغیر جان دے دیا کرتے تھے۔ یہ محبت کا اثر تھا اور رسول اللہؐ کی ذات کا' یہی وجہ تھی کہ ان کے گرد سب کے سب مَیں ' کی بجائے 'ہم' کہہ کر دُعا کیا کرتے تھے۔ دراصل اسلام کے اصلی جوہر کا راز جمعیت ہی کے ساتھ پیوست ہے۔مُسلِم اور مومن کے لئے یہ گناہ اور کُفر ہے کہ وہ اپنے لئے دُعا مانگے' یا عمل کرے چاہے وہ عمل دنیا کے لئے ہو یا عقبیٰ کے لئے۔اسلام کا مطمع نظر ہے ہی جمعیت سے متعلق اور قُرآنِ کریم کی جتنی بھی دعائیں ہیں سب کی سب جمع کے صیغہ میں ہیں۔ جہاں بھی صیغہ واحد آتا ہے تو غور سے بطنِ قرآن پر نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ صیغہ واحد کا صرف ان افراد پر اِطلاق ہوتا ہے جو فردِ مرکزِ جمعیت ہو۔ (انا اُمّتی ہو)

موجودہ زمانہ کے اچھے اچھے فقراء بھی میرا فراق' میری جلن' میرا مقام کہتے ہیں۔اور اسلام کا نکتہ نظر ہے ہمارا۔ یہ رمز غوث پاکؒ کی جوتیوں کی خاک پڑ جائے تو انسان پر کھل جاتا ہے۔پھر انسان یہ نہیں کہے گا کہ میں قطب بنوں گا' فلاں بنوں گا' بلکہ جمعیت کو دیکھے گا۔اس جمعیت کو جس کے لئے رسولِ کریمؐ نے آنسو بہائے' جس کی خاطر بھوکے رہے' پیٹ پر پتھر باندھے۔ وگرنہ کیا رُسولؐ خدا کے پاس کھانے کو روٹی کا ٹکڑا نہ تھا۔ یہ جمعیت کا درد، جمعیت کا غم ہی تو تھا۔آج ہم ہیں کہ جمعیت کو نظر انداز کر کے اللہ کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ تو ایسی بات ہے کہ شاہکار کی طرف نظر بھی نہ ڈالتے ہوئے بلکہ اس سے نفرت کرتے ہوئے پھر مُصّور سے ملنے کی آرزو میں بیٹھے ہوں۔حالانکہ شاہکار کے ذریعے ہی مُصّور کی عظمت کا اندازہ ہوسکتا ہے اور مُصّور کا قرب حاصل ہونے کی تمنا کی جاسکتی ہے۔حدیث شریف ہے،

خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَنْفَعُ النَّاسِ

''بہترین وہ ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے''

یعنی اللہ کی نگاہ میں سب سے بہتر اور پسندیدہ عمل مخلوق سے محبت کرنا ہے۔ اسی قسم کے کھلے اور واضح احکامات بالائے طاق رکھ کر اُمّت ہے کہ اپنی بخشش، اپنی نجات اور حق تک اپنی اپنی رسائی میں لگی ہوئی ہے۔ حالانکہ کسی فرد میں جب جمعیت کا درد، جمعیت کی محبت، آجاتی ہے تو اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ اگر اللہ بھی کہتا ہے ادھر آؤ تو وہ کہتا ہے ٹھہرو۔ مجھے یہ کام کرنے دو۔ یہ جمعیت کا درد پیدا کر کے دیکھو۔ پھر اس کی حقیقت کھلتی ہے کہ خالق مخلوق میں ہی مل سکتا ہے۔

اب فقر میں ضرورت ہے کہ 'مَیں' کی جگہ 'ہم' کا تخیل آنے لگے۔ مسلمان یہ کرنے لگ جائیں تو قوم کا بیڑا پار ہو، قوم کا ہوا تو افراد کا بھی ہو جاتا ہے۔ جمعیت میں ہی برکت ہے۔ برکت کی تشریح کوئی کیا کرے۔ یہ اونچا مقام ہے۔ نباتات کی موجودگی بارش لاتی ہے' والی بات ہے۔ رشتہ بندھ جانے کے بعد یہ اُمّت پر فضل وکرم لانے والی بات ہے۔ کر کے دیکھنا ہوتا ہے۔ اس حساب کتاب کی دنیا، اس عِلتّ ومعلُول کی دنیا اس عمل وثمر کی دنیا سے ماوراء ایک اور دنیا ہے، جہاں سے برکات اور خلوص کا نزول ہوتا ہے۔ اور اس کا رابطہ صرف جمعیت' جمعیت کے عمل اور ایمان پر مبنی ہے۔ یہ راز مسلمان نے کھو دیا ہے اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ موجود زمانہ میں نفسِ جمعیت' جمعیت کی زندگی' جمعیت کا فروغ' جمعیت کا ایمان بیگانہ سے معلوم ہونے لگے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ عوامُ النّاس نے آج تک اپنی خودی سے بلند تر ہو کر نہ کبھی محبت کی ہے نہ جمعیت کی خاطر اور عمل فی سبیل اللہ قدم اٹھایا ہے۔ کہتے تو ہیں کہ آج کل خداوند چاہے مسلمانوں کا ہو یا عیسائیوں کا یا ہنود کا وہ مادّہ ہے۔ اور مادّہ اور شکتی پرستی کا زمانہ ہے۔ مگر کائنات اسی کی ہے' مخلوق میں جھلک اسی کی ہے۔ یوں اللہ کو ڈھونڈا نہیں ملا' مگر قسم ہے اسی ذات کی' دیکھا ہے اور ضرور دیکھا' مخلوق میں۔

مخلوق، تجلّی حق کا مظہر:

یہ وحدت الوجود عقلی گدّے والی بات ہے۔ قسم ہے اس ذات کی بغیر تعیُّن کے کام نہیں بنتا۔ وہ جو غیب درغیب ہے، اسے تو کیا دیکھ سکو گے۔ مخلوق میں اسی کی تجلی کو دیکھو۔ نبی کریمؐ نے بھی مخلوق میں ہی حق کی تجلی پر زور دیا تھا۔ اور اسلام کا پہلا سبق جمعیت بندی، اُخوّت رُحماء بینھم کا دیا تھا تا کہ اس طرح

حق تک رسائی ہو سکے۔ یہ وہی حق تو ہے جو ہر مخلوق میں ''انا'' کی تجلی دے رہا ہے یہ ہر ایک میں ''انا'' اسی حق کا پرتو ہے۔ اس حقیقت کو اپنی ذات پر تجربہ کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ کچھ اس طرح جیسے کہ سورج کی روشنی جب ہم تک پہنچی اور ہم نے اس کو پالیا تب جاکر وہ ذاتی ہوگئی۔ بالکل اسی طرح ہر فرد کا اپنے رب سے رابطہ مخلوق سے رابطہ کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ یہی تو بات تھی کہ معراج میں میرا رب حضورؐ نے فرمایا تھا۔ اور اس وصال کے بعد اُمتی اُمتی۔ یہ اُمتی اُمتی کی حقیقت اور اہمیت دلوں پر تجلی دے جائے تو نئی حیات اُمت کو عطا ہو۔ اسی تجلی کا اثر تھا کہ حضورؐ نے فرمایا کلُّ مومِنٌ اِخوَۃٌ اور سب نے قولاً نہیں فعلاً اسے سچا کر دکھایا۔ پہلا مسلمان حضورؐ کے ہر فرمان پر آنکھ بند کر کے عمل کرتا تھا۔ اسے ارشاداتِ گرامی پر مکمل ایمان تھا۔ وہ سپاہی کی طرح ہر حکم کی تعمیل کرتا رہا۔ اور جب تک سپاہی رہا ہر میدان میں عروج پر رہا اور جب بن گیا ظن و تخمین والا اور مشورہ دینے والا برہمن، تو اسلام کے بہتے دھارے سے علیحدہ ہوگیا۔ یہ تعمیل حکم، یہ عمل سوائے اس کے تھا بھی کیا کہ جمعیت کی خاطر، جمعیت کی بقا کی خاطر، جمعیت کے فروغ کی خاطر انہاک کار۔ آج پھر وہی زمانہ ہے کہ اسلام کی وہی اوّلین سادگی، وہی ایمان کی روشنی، وہی جمعیت کا خلوص لوگوں کے دلوں میں ڈالا جائے۔ مگر کس طرح؟ طریقہ کار سوائے اس کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے کہ بے لوث عمل، خدمتِ خلق، عمل فی سبیل اللہ کے ذریعے اخوت کا رشتہ باندھا جائے۔ خدمت و خلوص کچھ لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ سچی خدمت کے بعد ہی خلوص پیدا ہوسکتا ہے۔ وگرنہ یوں تقویٰ یا فرض سمجھ کر ظاہر داری سے عمل کر لینے سے کچھ اپنی ہی انا کی خدمت ہو جاتی ہے۔

اس لئے ارشاد باری میں پہلے عملِ صالح، عمل فی سبیل اللہ کا ذکر ہے اور ایمان ایک لازمی نتیجہ کی طرح اس سے وابستہ ہے۔ اس عمل صالح والے مومن کے لئے پھر بشارت ہے، حیات طیبہ سے نئی زندگی عطا ہونے کی، جو ظاہر ہے اس زندگی سے لطیف ہی زندگی ہے۔

ہم عمل صالح کے معنی اور پاکیزہ زندگی کے معنی یہ لیتے ہیں کہ اس سے بچو، اس سے بچو، اس قسم کا پرہیز اور تقویٰ۔ اس قسم کا ''لا'' تو اپنی ہستی سے ہی انکار کرنا ہے، اور ادھر حکم ہے قدم اٹھا کر عمل کرنے

کا۔اور عمل صالح ہو بھی کیاسکتا ہے، سوائے اس کے کہ جمعیت کی خاطر انہاکِ کار ہو۔ ”
سِر وعلانیہ“یعنی ظاہری اور باطنی دونوں نظاموں میں خلوصِ عمل اور جمعیت بندی۔

مستقبل کے سوتے

نبی کریمؐ کے جومقرر کردہ نقشے تھے، ان کے صدیوں بہ صدیوں مجدّدین آکر ورق پلٹتے گئے۔اگلے تین چارصدیوں کے نقشے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلا سب اٹھ گیا۔اب چشمہ ہی پھوٹنا ہے فقر کے باطنی نظام کا جس کا تعلق عالمِ ولایت سے ہے۔جس کے نقشے حضرت بابا فریدؒ کے یہاں سے چلے تھے اور جس کی مستحکم بنیاد اس صدی میں حضرت بابا تاج الدین ناگپوریؒ نے رکھی۔اس باطنی نظام کا علم اسی کو ہوسکتا ہے جس کی باطن تک رسائی ہو۔نہ صرف اپنے باطن تک بلکہ باطنِ وجود یا کم ازکم باطنِ ملت تک۔یعنی انا اُمّتی والی بات۔

اُمّت کے احیاء کا جو درخت بابا تاج الدینؒ نے لگایا تھا اس کی پوری پرورش حضور بابا قادر اولیاءؒ نے تمام آفاتِ آسمانی و روحانی اپنے اوپر لے کر کی۔یہ کام استغراق کے عالم میں ایک ایسی ہی ذات کرسکتی ہے جومرکزِ عالم ہو۔یوں اپنے اپنے زمانے میں بہت سے آئے اور کیا کچھ کر گئے۔مگر کس کس نے اُمّت کی خاطر اتنے ٹوکرے ڈھوئے ہوں گے اور کون کون وعدے کے ساتھ آیا اور کیا کر گیا۔بابا قادرؒ کا ارشاد ہے کہ اب کچھ نہیں کرنا اُمّت کو سوائے اس کے پھل کھائے۔اب وقت آگیا ہے فتح مبین کا۔اب عالمِ امر میں انقلاب ہے۔اب نئی دنیا ہی بننی ہے۔پرانی ضعیف ہو چکی ہے۔علاج کی کوششیں بے کار ہیں۔اب نئی دنیا کے بنانے کے لئے البتہ روپے میں سولہ آنے ادا کرنے ہوں گے۔کل کے کل۔

چودھویں صدی میں بسم اللہ سے رفتار زمانہ کو بدلنا ہے۔اٹکے ہوئے یوں ہیں کہ اس راز سے ناواقف ہیں۔بسم اللہ کا اِذن نہ ہونے سے ہر عمل میں رکاوٹیں ہیں۔اِذن بڑی چیز ہے۔یہی تو امر ہے۔ کُن فَیَکُوْن والی بات ہے۔اسم اعظم کے متعلق تو دفتر کے دفتر لکھے گئے ہیں لیکن بسم اللہ کی گہرائی کو کسی نے نہ پکڑا۔عارفین جو زندگی کا نچوڑ دیتے ہیں وہ یہی بسم اللہ ہے۔جب بات بنتی ہے۔جب اجتماعیت

میں بِسم اللہ کی روح پھونک دی جائے تو پھر کیا کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہی تو وہ حالت ہوتی ہے جس میں کن فیکون کا رفرما ہوسکتا ہے اور زمانہ کو ایک نیا رُخ عطا ہوسکتا ہے۔ گویا جمعیت میں ایک انقلاب لانا ہوتا ہے۔ عالمِ امر سے۔

عالمِ امر کی بات یہ ہے کہ فقیر آمر باللہ کا تعلق عالمین سے ہوتا ہے اسی لئے وہ فقیر، فرد، جمعیت، انسانیت، خدائی کو اپنے باطنِ وجود میں سمیٹنے کے بعد حیات کو ایک نیا رخ دے دیتا ہے۔ فرد کی حد تک اس کی کارفرمائی یہ ہے کہ پیرِ کامل کی بسم اللہ کی پہلی ٹھوکر سے عشق میں قیام پاتا ہے۔ چوتھے آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری ٹھوکر کن فیکون، ساتواں آسمان، روح میں قیام، انا رُوحی پکار اٹھتا ہے۔ پھر تیسری ٹھوکر اسم ذات کی، جس کے ذریعے غیب تک رسائی ہوتی ہے۔

یہ فرد کی حد تک عالم امر میں انقلاب نہیں تو اور کیا ہے۔ کہاں مرشدِ کامل کی یہ شان اور کہاں وہ زمانہ کہ پہلے گھسائی کرتے تھے۔ پھر برتن صاف کئے جاتے تھے اور پھر قلعی۔ اب تو یہ زمانہ آگیا ہے کہ ذرا سا نور ڈال دیا، تاریکی خود بخود غائب یا تیزاب ڈال دیا اور آبِ رواں سے دھوکر چمکا دیا۔

اللہ اللہ کہاں وہ پہلے کی سختیاں کہ فنا سے منزل شروع کرتے تھے اور تیس، تیس، چالیس چالیس برس لگ جاتے تھے اور کہاں یہ بات کہ اب منزل ہی بقا سے شروع ہوتی ہے۔ یہی تو ہے وصل والی بات۔ تھوڑا سا نور ڈال دیا اور نورٌ اعلیٰ نُور بنا دیا۔

پہلے لوگ مُجاہدے کرکے نفس اور عقل کے پھندوں سے نکلنا چاہتے تھے۔ پھر مقامِ قلب اور مقامِ رُوح تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ لمبا راستہ تھا۔ اب یہ راستہ ہے کہ برکت بسم اللہ خدمت کرو۔ وقت کا دھارا احیاء زندگی میں ہے، شدتِ عمل میں ہے۔ صرف ایک دُکھے ہوئے دل کی دُعا لے لو تو بیڑا پار ہے۔ بسم اللہ کا اذن ملنے کے بعد کسی پر محبت سے ہاتھ رکھ دیا جیسا کہ یتیم کے سر پر یا مسکراہٹ ہی دے دی۔ تو یہ کرتے کرتے انسان پھیلنے لگتا ہے۔ کائنات کو سمیٹنے لگتا ہے۔ بس یہ دل سے چاہنا ہوتا ہے۔ اسی امرِ بسم اللہ کی شدت سے بڑے بڑے کام فردِ، اُمّت اور انسانیت کے لئے کئے جاسکتے ہیں۔ مگر ہو تو ایسی

فقیری۔تلوار کی دھار سے بھی تیز والی بات ۔اس طرح کائنات کو سمیٹ لیتے ہیں، اتنی برکت ہوتی ہے کہ دوسرے بھی کثیر تعداد میں یہ کرنے لگ جاتے ہیں۔ خواہ مخواہ حد تک ہی سہی۔ اسی محبت اور خدمت سے انسان میں بے نیازی آنے لگتی ہے اور اس کو وسعتوں میں پھیلنا آجا تا ہے۔اس بے نیازی سے وہ ہر آرزو سے گذر جاتا ہے اور اس کی ہر آرزو پوری ہوتی ہے۔

اقدامات ونصبُ العین

یہ تو رہی فرد کی حد تک کی بات اور جب جمعیت میں یہ ہونے لگ جائے اس کی حیاتِ طیبہ کے کیا کہنے۔اب مقررّہ نقشوں کے مطابق ہی احیاء دین ہونا ہے۔ چودھویں صدی کے جو نقشے ہیں ان میں پہلا قدم "لا" ہے۔مسلمان کو شاہین سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جو خود شکار کرتا ہے اور زندہ گرم خون کو اپنی غذا بناتا ہے۔گدھ مُردار کھاتا ہے۔ ماضی مُردار ہے چاہے وہ اپنے گناہ ہوں یا عملِ صالح۔مومن کی نگاہ اپنے آگے ہوتی ہے۔میدانِ جنگ میں اپنے رفقاء اور اولاد کی نعشوں کو پھاندتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔اسے مڑ کر دیکھنے کی مہلت کہاں۔منزل پیشِ نظر ہے اور والہانہ انداز سے وہ آگے بڑھتا ہے۔گناہوں کے توبہ کی مہلت کہاں، اپنے کردار کے جائزے کی اسے فرصت کہاں۔نفس سے جہاد انسان اس وقت کرے جب تاریکیاں حائل ہوں۔مگر جب شمسِ حقیقت آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہو تو اور کوئی چیز اسے کیا نظر آئے گی۔کیسا نفس سے جہاد، جب وہ سما گیا تو یہ خود ہی کہاں اور کیسا نفس۔

یہ ایک مشہور نفسیاتی بات ہے جو روزمرہ زندگی میں زندگی کے ہر پہلو میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جو جس کا تصور کرتا ہے وہی اس کا انجام ہوتا ہے۔ہم اپنے گناہوں کے تصور میں گھرے رہے چاہے وہ صورت توبہ استغفار کی ہی کیوں نہ ہو۔گناہ ہم سے چھوٹ نہیں سکتے۔ جو بیمار اپنی بیماری کے خیال میں ہر وقت مشغول رہتا ہے اس کے لئے نہ کوئی دوا اور نہ کوئی دعا، اس کو اس کی بیماری سے جدا کرسکتی ہے۔تصوّر، عشق کی جلا ہے۔اور عشق کے راستہ کو اللہ بھی کبھی توڑنا نہیں چاہتا۔چاہے وہ عشق ظلمت سے ہو یا بیماری سے یا تباہی سے۔ہم اپنے بزرگوں کے کارہائے نمایاں پر خوش ہوتے ہیں، اپنی ملت کے گناہوں پر روتے ہیں۔یہ

دونوں ہی ماضی میں مُردار ہیں۔مومن مجاہد کی نظر آگے ہوتی ہے۔مستقبل پر۔ پیچھے مڑکر صرف وہ دیکھتا ہے جس کے دل میں خوف ہو۔ اور جس کے دل میں یقین ہو، اس کو مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چودھویں صدی کے مشن کا یہی ہے کہ پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔ پتھر کے ہو جاؤ گے، زندگی کھو بیٹھو گے۔

دوسرا قدم اِلّا اَللہ عمل صالح ہے، بے لوث عمل، جس کی اگر عالمِ اسباب میں جزا ہے تو عالم امکان میں جزائے احسن۔ایمان اور احسان ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔احسان وہی کر سکتا ہے جس نے عشق کی غربت کی چادر اوڑھ رکھی ہو۔

دوسرا قدم یہ ہے کہ بسم اللہ کہہ کر کوئی بھی ایسا کام کرو جس سے تمہارا انفرادی حیثیت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہ ہو۔کوئی خیرات بھی کی تو تحت الشعور میں یہ بھی گمان نہ آئے کہ اس کا اجر ہوگا یا یہ کہ وہ غریب دُعا دے گا۔ایک دفعہ کر کے دیکھو۔عمل کی برکت سمجھائی نہیں جاسکتی۔موڑ سے پرے کیا ہے۔تم دیکھ نہیں سکتے قدم اٹھاؤ تو آنکھیں کُھل جاتی ہیں۔ سارے اس موڑ پر رکے ہوئے ہیں۔ یہ موڑ وہ ہے جہاں پر انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔انفرادیت کے تنگ و تاریک راستے کی بجائے جمعیت کے گلزار اور آگے سمندر، اور آگے آسمانوں کی وسعتیں بغیر حجاب در و دیوار پیش آتی ہیں۔ یہ بھی ایک نفسیاتی تجربہ ہے کہ سچی خوشی جو ہر کسی کا دل چاہتا ہے کبھی بھی اپنی خاطر عمل کرنے میں آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ چاہے وہ عمل فوری ہو یا دور رس، ایک خوشی کی پھریری ضرور ہوتی ہے۔مگر بعد میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پردہ تھا، ایک دھوکہ تھا۔ جو انبساط اور زندگی کے چشمے قلب میں ابلنے لگتے ہیں، وہ صرف ایسے قلب جانتے ہیں جو بے لوث عمل کرتے ہیں۔ یہ تو رہا فرد کی حد تک۔

اور سبحان اللہ جمعیت کی برکت یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی مرکز کے دل میں کسی عملِ صالح کا خیال ڈالتا ہے اور وہ اپنے کسی دوست کے سامنے اس خیال کو پیش کرتا ہے، تو محض اس لئے کہ اس کی نیّت میں خلُوص ہے، دوسرا دوست بغیر کسی تامل کے فوراً لبیک کہتا ہے۔ دوست کے معنی یہی ہیں۔حضرت عمرؓ اسی طرح نبی کریمؐ کے ہر قول پر جوش کے ساتھ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے لبیک پکار اٹھتے تھے۔

یہ نیّت کی برکت ہوتی ہے۔ اور جب دو سے چار ہو جائے تو فضا میں ان کے ایمان کی خوشبو اور ان کے جوش کی لہریں، موجزن ہو جاتی ہیں اور سارا عالم چاہے اس پیغام کو سنا ہو یا نہ ہو اپنا لیتا ہے۔ اور اس میں خوبی یہ ہے کہ ہر ایک یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خیال اپنے کرم سے مجھ میں ڈالا۔ یہ خلوص کی برکات ہیں۔ ایک حدیث قُدسی ہے کہ خلوص بندگی کے ان اسراروں میں سے ہے جو میں اپنے بندوں کو عطا کرتا ہوں، جن سے مجھے محبت ہے۔ یہ سرّیہ اسرار کے رمز صرف عمل سے آشکار ہوتے ہیں۔ جہاں تک جمعیت کے عمل کا پہلو ہے اس فکر کی کوئی ضرورت ہی نہیں کہ آج کل ہم میں یہ برائیاں ہیں اور یہ نقائص ہیں۔ حاشا غور سے دیکھو تو ذرّہ ذرّہ کے قلب میں حق بے چین ہے کہ مَیں ' کا حجاب اٹھے اور آشکار ہو اور مَیں' کا حجاب اٹھنے کا طریقہ نفس سے جہاد نہیں بلکہ فرد کو ملت میں ضم کر دینا ہے۔ سوچو، معراج کے متعلق سوچو، عشق کی انتہا کو سوچو۔ بظاہر یہ انفرادیّت کی بھی انتہا ہوتی ہے مگر نبی کریمؐ کا جب آمنا سامنا ہوتا ہے تو وہ وصل کے طالب نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں تو اسی رُوپ میں کہ ملتؔ کے حجابات اٹھیں۔ ان کی بخشش ہو۔ میرا وصل کوئی معنی نہیں رکھتا۔

جب تک کہ جیسے کسی فرد کے لئے نصبُ العین موجود نہ ہو تعینِ راہ نہیں ہو سکتی اسی طرح جب تک کہ ملتؔ کے آگے ایک بیّن نصبُ العین نہ ہو جس کا ان کو نہ صرف یقین ہو بلکہ جس کو عقل کی آنکھ بھی دیکھتی ہو، تعین مشکل ہے۔ اس ملت کا نصبُ العین غلبہ اسلام تھا۔ کیا اس مِلّتِ مرحومہ کا نصبُ العین آج بھی یہی ہے؟ غلبہ اسلام کے کیا معنی ہیں۔ کیا اس کے معنی ملک گیری، کیا اس کے معنی افراد کی جاہ وحشمت، کیا اس کے معنی تسخیرِ فطرت ہیں۔ نہیں نہیں انبیاء کے بعد تکمیلِ انسانیت کا مقام رَضِیَّ اللّٰہُ عَنْہُ اس کی رضا کو ڈھونڈنا اس کی رضا کو پانا ایک مومن اور مسلِم کی جستجو ہو سکتی ہے۔ جب تیری رضا اور میری رضا کا اُمتیاز اٹھ جائے تب ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ غلبہ اسلام یہ ہے کہ ساری وہ کشافتیں جو ہمارے ارتقاء اور ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ نے تشکیل کی ہیں ان میں الجھنے کی بجائے ان میں سے راستہ ڈھونڈیں اور اسی پر چلیں۔ رکاوٹیں نہ ہوں تو شدت عمل کیسے نصیب ہو سکتی ہے اور باطن کی سوئی ہوئی خوبی اور اخلاق کی صلاحیتیں کہاں جاگ سکتی

ہیں۔

اس شدتِ عمل اور ایمان کی جزاء حیاتِ طیبہ سے زندگی عطا ہونا ہے اور احسن بدلہ ملنا ہے۔ اس کے اعمال کا "سبحان اللہ" جمعیت کا بے لوث عمل بخشش ونجات کے چکروں سے تو یوں ہی آزاد ہے، اسی لئے بہت جلد یہ عمل جمعیت کے ایمان کا ذریعہ بن جاتا ہے، اور اس کی جزا ملتی ہے، جمعیت کو حیاتِ طیبہ سے زندگی عطا ہونا۔ لہٰذا وعدہ فرقان غلط نہیں ہوسکتا۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

"تم ہی سربلند ہوگے اگر تم مومن ہو"

پر ہر اُمّتی کو ایمان رکھنا چاہیے۔ احیاء اسلام کے لئے چند سالوں میں نئی چیزیں ظہور میں آئیں گی۔ پاکستان سے چین تک تمام علاقے میں اسلام پھر سے اٹھے گا۔ افریقہ اور امریکہ کی سیاہ فام نسلوں کو قدرت کے خزینہ سے وہ حصہ عطا ہوگا جو ان کے لئے مخصوص ہے۔ ازبکستان کے باشندوں، وزیریوں اور آفریدیوں جیسی پاک خون والی قومیں قدرت کی منظورِ نظر بن چکی ہیں۔ آگے کی تاریخ یہیں سے بننا ہے۔ لال قلعہ دہلی پر سے سبز جھنڈا بلند ہوگا۔ آگے کی صدی اور مابعد اہم زمانہ ہے۔ ایٹم بم کی بابت بھی بتایا جاچکا ہے کہ یہ سب پھُس پھُسا کر رہ جائیں گے جیسا کہ موسیٰ کے ڈنڈے کے آگے جادوگروں کے سانپ۔ بات یہ بھی ہے کہ پہلے اُمتیں اور قومیں پوری کی پوری مٹ جاتی تھیں لیکن رحمۃ اللعلمین کے آنے کے بعد اب ایسا نہیں ہونا۔ اب ایٹم بم سے بھی کلی طور پر تباہی نہیں ہو سکے گی۔ غرض اب فتحِ مُبین ہے۔ سب کے لئے کچھ ہوگا، بھلا ہوگا۔ نئے رنگ، نئی آن، نئی زندگی، حیاتِ طیبہ سے پھر دینِ مُبین اٹھے گا۔ اور چالیس سال کے عرصہ میں پھر سے دینِ مُبین اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کے نیزہ پر بلند ہوگا۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ

فَبِاَيِّ اٰلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ

احیائے اُمّت، مشیت حق:

ہمارے تمام کردار و اعمال مشیتِ حق کے تابع ہیں۔ مشیت کی تلاش کریں، مشیت کو سمجھیں تو راستہ کھلا نظر آنے لگے گا۔ یہ کیفیت حال سے متعلق ہے۔ حال ہی میں اللہ کی نشانیاں نظر آسکتی ہیں۔ جن پر غور وفکر کرنے کے لئے بار بار قرآنِ پاک میں تاکید ہے۔

قلب ہی عرشِ الٰہی ہے۔ جب الم نشرح ہو جائے تو ایک ہی حق جلوہ فرما نظر آتا ہے۔ اگر یہ عادت ڈال لیں کہ احساس رہے کہ اس چیز کو اللہ کیسے دیکھتا ہوگا تو سب تفرقہ مٹ جاتا ہے۔ ہر چیز سے محبت ہو جاتی ہے۔ مشیت کو دیکھ کر اس کے ساتھ عمل کرنے کا لُطف آنے لگتا ہے۔ مشیت تو ہے ہی رحمتِ عالم۔ مشیت تو بے تاب ہے کہ انسان سے ''میں'' کا پردہ ہٹے اور حق تک اس کی رسائی ہو۔ پھر جمعیت کے لئے رحمت کی بے تابی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہ معراج کا نکتہ ہے۔ اُمّتی اُمّتی والی بات ہے۔ لوحِ محفوظ سے اوپر کی بات ہوتی ہے یہ رحمتً لِلعالمین، اس مقام سے لوحِ محفوظ کے لکھے کو بھی بدلا جاسکتا ہے۔ مشیتِ حق تو لَوْلَاکُ مَاخَلِقْتَ الافْلَاکَ کا پیغام دے رہی ہے۔ مشیتِ حق نظر نہ آسکے تو مشیرِ حق پر ہی کم از کم انسان اعتماد کر لے تو بات بن جاتی ہے۔ مشیرِ حق وہی وہی ہوگا جو امرِ باللہ رکھتا ہو۔ جو مشیر رسُولؐ ہو۔ انا اُمتی کا مقام رکھتا ہے۔ جس کی جان، جانِ عالم ہو۔ ایسے مرکز کے گرد خود نشر حق ہونے لگتا ہے کیونکہ وہ سوائے حق کے کچھ نہیں بولتا۔ وہ خود بندہ ہیچدان ہوتا ہے۔ فنا کا مقام حاصل کئے اور حق سے واصل، حق کے ساتھ بقاء کے لئے۔ اس کی حَیَاتُ اَلْحَیَات سے منسلک ہوتی ہے۔ ایسی ذات جب درمیان میں آجاتی ہے تو مخلوق خود جمع ہونے لگتی ہے۔ لائحہ عمل خود بخود بننے لگتے ہیں۔ اور راستے کھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہستی کی ہر بات پر لوگ آمنَّا وَصَدَّقْنَا کہنے لگ جاتے ہیں۔ اس کے قلب سے جو بات نکلتی ہے ہدایت لئے ہوتی ہے۔ دوسرے قلوب خود اس کی تصدیق کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ سوائے حق کے کچھ نہیں ہوتا۔ حق میں دُوئی کہاں۔ ایسے مرکزِ حق کے وجود میں پائیداری ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے پیچھے کوئی اور ہاتھ کام کرتا ہے، مشیتِ حق، امر باللہ۔

صاحبِ حق کی احتیاج اور کارفرمائی:

چراغ جتنی روشنی دیتا ہے اس کے گرد اتنا ہی اجتماع ہوتا ہے۔سورج نکل آئے تو مخلوق فیض یاب ہونے لگتی ہے۔یہ خود بخود ہو جاتا ہے۔اجراءِ حق کے لئے احیاءِ اُمت کے لئے صاحبِ حق کی ضرورت ہوتی ہے۔اُمتِ مُسلمہ کا سارا عالم تابع فرمان ہو سکتا ہے۔کوئی اٹھے تو امر اور صداقت کے ساتھ، ایمان کے ساتھ۔

یہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی چھوٹی ملمع کاری جو نظر کو خیرہ کرتی ہے اس میں صداقت نہیں۔کہاں امر باللہ کی بات کہاں انسانی کاوش، خواہ کتنی ہی صداقت اور انہماک کے ساتھ کیوں نہ ہو۔جس کام کے پیچھے مشیت حق نہ ہو اس کی بساط کیا۔مومن تو حق کی مشیت کو تلاش کرتا ہے۔نہ کہ اپنی بنائی ہوئی راہوں پر حق کو چلانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ان چھوٹی جماعتوں کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے۔اپنی مختصر جماعت کے نظریوں اور نفسا نفسی سے ہٹ کر آنا اُمتی والی بات، یا رحمت اللعالمینی شان ان جماعتوں میں نہیں ہوتی۔ ان کا لائحہ عمل بہت نچلی سطح پر ہوتا ہے اور صرف دنیاوی زندگی سے متعلق۔ایسی جماعتیں کوئی مستقل پیغام دنیا کو نہیں دے سکتیں۔

احیاءِ اُمت کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ عالم مثال میں جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے وہ عالمِ امر کی کارفرمائیاں ہیں۔ایک دنیا کا نظام ہی کیا، لا تعداد باطن کے میدان ہیں، قلب و رُوح کے میدان ہیں جن میں عالم امر کے سہارے سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔البتہ عالمِ امر سے تعلق پیدا کرنے کے لئے مشیت حق سے نسبت قائم کرنی ہوتی ہے۔اِنَّا فَتَحْنَا کا پیغام اگلی صدیوں میں اسلام کے لئے ہمیشہ کھلا ہے۔ اسلام تو جائے امن ہے۔کیا افراد کے لئے، کیا جماعت کے لئے اور عالمین کے لئے اسلام کی وسعتیں لامحدود ہیں۔اب بھی عالم امر میں مملکتِ باطن میں ایسے ہزاروں میدان ہیں جن میں موجودہ مسلمان نے قدم ہی نہیں رکھا اور اپنی مختصر اور محدود ظاہری زندگی کو سدھارنے میں ہی ساری کاوشیں ختم کر دیں۔وہ بھی صرف دنیاوی سطح پر اور بہت مُبْتَذَلْ طور پر حالانکہ دنیا کو دنیا کے طریقوں سے ہی اعلیٰ طور پر، صداقت اور

انہاکِ کار سے سنبھالنے سے دوسری قومیں کہیں عام ظاہر کی زندگی میں کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہیں۔

اسلامی اُمت کے احیاء کی بات تو دونوں جہانوں کی سرادری کا سودا ہے۔ ظاہر و باطن کا سودا ہے۔ مشیتِ حق تو ہے کہ اُمّتِ محمدیہؐ کو پھر سے سرادری عطا ہو۔ لیکن قوموں کا اٹھنا انسانی قوانین اور کوششوں سے باہر کی بات ہے۔ کیونکہ زندگی سے سرچشمہ زندگی پیدا نہیں ہوتا۔

عمرؓ نے بھی شعاعیں بنائی نہیں جب ظاہر بین نگاہوں سے سورج چُھپ گیا تو پھیلی ہوئی شعاعوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ عمرؓ بننا اپنے بس کی بات نہ تھی البتہ جو منتخب ہو چکا ہو وہی عمرؓ بن سکتا ہے۔ اپنی کوشش یا انسانوں کے کہہ دینے سے عمرؓ نہیں بنتا۔ لیکن کیا جب تک عمرؓ نہ بھیجا جائے کچھ نہ کیا جائے۔؟ کیوں نہیں سطح کا فرق ضرور ہوگا مگر صداقت سے کوئی چیز کی جائے تو اللہ صلہ ضرور دیتا ہے۔ جمعیت کے ہر عمل میں برکت ہے۔ صُلحِ کُل کا نقشہ کوئی ایک گروہ پیش کرے تو مخلوق خود جمع ہونے لگتی ہے۔ برکت کی تشریح کی نہیں جاسکتی، یہ کر کے دیکھنا ہوتا ہے۔

افراد میں ملت کے احیاء کی تڑپ بلاواسطہ نہیں ہوتی۔ یہ بھی اسی مشیت حق کے تحت ہے۔ جو احیاء اسلام کے لئے حق کی طرف سے مقرر ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ چالیس یا زائد سال میں دینِ متین پھر سے سربلند ہوگا۔ لہٰذا بسم اللہ کہہ کر جو بھی قدم اٹھائے اس کی کشتی الحیات کے سمندر میں تیرنے لگے گی۔ اور اس صداقت کی وجہ سے دوسرے بھی اسی طرح کثیر تعداد میں یہ کرنے لگ جائیں گے اور سارا بیڑا بحرِ حق میں موجزن ہو جائے گا۔

مگر اس کا سارا راز امرِ بسم اللہ میں ہے۔ یہ حاصل ہو جائے تو کائنات میں صرف ایک باایمان شخص کوئی قدم اٹھائے تو اس کے ایمان کی خوشبو سے دو سے چار اور پھر کثیر تعداد میں خلقت اس پیغام کو اٹھانے لگ جاتی ہے۔

اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ کا وعدہ کھلا ہے۔ وعدہ فرقان غلط نہیں ہوسکتا یہ اُمّت بنائی ہی اسی لئے گئی ہے کہ خیرِ اُمّت کا لقب اسی پر صادق آئے۔ اور قائم ہی اس لئے رکھی گئی ہے کہ اس کے ذریعے منشائے الٰہی پورا ہو

جائے گا۔ جب محبوبؐ کو اپنا لیا ہے تو اس کی اُمّت کو بھی اپنا لیا گیا ہے۔ وگرنہ بغیر محبوبؐ کے اُمّت کی اپنی حقیقت کچھ نہ تھی۔ یہ رمز جب اُمّت نے پالیا اور اس کے محبوبؐ کا دامن پکڑ لیا اور شِدّتِ عشق کے ساتھ پکڑ لیا، حقیقتِ محمدیؐ کو نہ صرف سمجھ لیا، بلکہ اپنا لیا، تو زمانہ ہی پلٹ جائے گا۔ یہ فراق کا طویل دو وصال کی دائمی لذت سے بدل جائے گا۔ چودھویں صدی میں راستہ وصل سے ہی شروع ہو گیا ہے۔

❁❁❁❁❁